(پہلی قسط)

ورق ورق زندگی

پروفیسر خالد شبیر احمد

جناب پروفیسر خالد شبیر احمد مجلس احرارِ اسلام کے قدیم کارکن اور اِس وقت مجلس کے مرکزی نائب صدر ہیں۔ وہ سیاسیات کے استاد رہے۔ نصابی کتب کے علاوہ ''تاریخ محاسبۂ قادیانیت'' ''احرار، تحریکِ کشمیر اور قادیانیت'' اُن کی معروف تصنیفات ہیں۔ انہوں نے ایک بھرپور اجتماعی زندگی گزاری، تحریکِ آزادی کے رہنماؤں کو بہت قریب سے دیکھا۔ شخصی اور سوانحی تذکروں میں جغرافیائی تاریخ وثقافت کی مناسبت سے دل چسپ معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ جناب پروفیسر صاحب نے ہماری درخواست پر اپنی آپ بیتی تحریر کرنا شروع کی ہے۔ اِس میں خاندانی حالات کے علاوہ اُن کے ذاتی مشاہدات و تجربات، تاریخ وسیاست اور قومی رہنماؤں کے تذکرے قارئین کی معلومات میں خوشگوار اضافے کا باعث ہیں۔ پروفیسر صاحب کے شکریے کے ساتھ پہلی قسط نذرِ قارئین ہے۔ (ادارہ)

ابتدائیہ:

ایک مدت سے نہ جانے کتنے دوستوں کا تقاضہ رہا ہے کہ میں اپنی سوانح عمری لکھوں۔ لیکن میں مسکرا کر ٹال دیتا۔ وجہ یہ تھی کہ میں جانتا تھا کہ میں کونسی ایسی شخصیت ہوں کہ جس کی سوانح عمری پڑھنے کے لیے لوگ بے چین ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اتنی لمبی داستانِ زندگی لکھنے کے لیے بھی ہمت اور حوصلہ چاہیے جو مجھ میں نہیں، مجھے ایسے لگتا ہے کہ سوانح عمری لکھنا جیسے سمندر میں چھلانگ لگانے کے مترادف ہو، اس عمر میں اتنی لمبی داستان کیونکر لکھ پاؤں گا اور کون پڑھے گا۔ دوستوں کا اصرار شاید اس لیے ہے کہ میری زندگی بڑے لوگوں کے درمیان گزری ہے۔ جو علمی، ادبی اور مذہبی لحاظ سے واقعی بڑے لوگ ہیں۔ کچھ واقعات زندگی ایسے بھی ہیں کہ جنہیں بیان کیا جا سکتا ہے اور جنہیں لوگوں تک پہنچنا چاہیے۔ اصل میں یہی وہ بات ہے کہ دوستوں کا اصرار دن بدن بڑھتا ہی چلا گیا۔ لیکن میں اسی سوچ میں گم رہا کہ حالاتِ زندگی لکھوں یا نہ لکھوں کہ ملتان سے جناب سید کفیل بخاری کا فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے، اب اپنے حالات زندگی لکھیں۔ لہٰذا اُن کے حکم کی تعمیل میں ''چل میرے خامہ بسم اللہ'' کہہ کر لکھنا شروع کر دیا ہے، پہلی قسط نذرِ قارئین ہے، دعا کریں کہ یہ سلسلہ جاری رہے اور میں لکھ سکوں۔

شہر چنیوٹ:

چنیوٹ شہر دریائے چناب کے مشرقی کنارے پر آباد ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ چنیوٹ پاکستان کا قدیم ترین شہر ہے تو شاید اس میں کسی مبالغے کی صورت ہو، لیکن اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ چنیوٹ پاکستان کے قدیم ترین شہروں

میں سے ایک ہے جو اپنی ثقافت، تہذیب وتمدن، رسم ورواج، لباس، طرزِ بودوباش، ہنرمندی، معاملہ فہمی، ذہانت، شرافت میں ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہ مفروضہ صحیح اور درست ہے کہ شہر، آبادی کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ روایات وثقافت کی پختگی کا نام ہے تو پھر چنیوٹ کو ان شہروں میں شمار کیا جاسکتا ہے جو اپنی ثقافت اور اپنی روایات کے حوالے سے ملک بھر میں ایک منفرد اور دلکش حیثیت کے حامل ہیں۔ اگرچہ اس شہر کی آبادی بڑے شہروں کے مقابلے میں آج بھی بہت کم ہے۔

چنیوٹ کے قدیم ترین شہر ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس کا تاریخی احاطہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ جن لوگوں نے چنیوٹ کی تاریخی حیثیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اندھیرے میں ''ٹامک ٹوئیاں'' مارنے میں ہی کام لیا ہے کہ یہ کام ایک وزنی پتھر ہے جسے چوم کر چھوا تو جاسکتا ہے مگر اس کو سر پر اٹھانے کی ہمت کسی میں بھی نہیں ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ''شہر لب دریا'' کے مصنف ڈاکٹر محمد امجد ثاقب نے شہر کی تاریخ سے نظر چُرا کر اپنی تحقیق کو صرف شاہی مسجد اور عمر حیات کے محل کی کھوج تک ہی محدود رکھا۔

''تاریخ چنیوٹ'' کے مصنف ڈاکٹر ارشاد احمد تھہیم نے جی کڑا کر کے چنیوٹ شہر کے تاریخی نقوش کو اجاگر کرنے کی بڑی کوشش کی ہے۔ ان کی کاوش اپنی جگہ مگر اس کے باوجود انہوں نے اس عنوان سے جو کچھ تحریر کیا ہے۔ اسے ہر لحاظ سے مستند کہنا بھی۔ شاید درست نہ ہو کہ انہوں نے دس لاکھ سال اور بیس لاکھ سال پہلے کے حوالے سے چنیوٹ شہر کی موجودگی کا تاریخی حوالہ پیش کر کے پڑھنے والوں کو حیران وپریشان تو کر دیا لیکن قارئین کو اس حوالے سے مطمئن نہ کر پائے بس اتنا ہی کافی ہے کہ اس شہر کو پاکستان کا قدیم ترین شہر ہی کہا جائے یا پھر قدیم ترین شہروں میں ایک شہر، یہی اس کی شہرت کے لیے کافی ہے۔ چنیوٹ میری جائے پیدائش ہے۔ جہاں میں اپریل 1934ء میں اپنے دادا جان کے مکان میں پیدا ہوا‘ جو شاہی مسجد کے بالکل عقب میں شاہی منڈی کے پاس شاہی بازار میں واقع ہے۔

میرا خاندان:

چنیوٹ شہر میں میرا خاندان دینی، علمی اور ادبی لحاظ سے آج بھی پہچانا جاتا ہے۔ میرے خاندان کے بزرگ بڑے قابلِ احترام اور لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں یہ الگ بات کہ اب نئی نسل کے لوگ ہمارے بزرگوں سے ویسے ہی ناآشنا ہیں جیسے آج ہم ملت اسلامیہ کے عروج سے یا پھر اپنے شاندار ماضی سے ناآشنا حال کی خرمستیوں میں اپنے مستقبل سے بالکل غافل ہو کر رہ گئے ہیں۔

میرے خاندان کا انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے حوالے سے ذکر مختلف کتابوں میں موجود ہے۔ خصوصیت کے ساتھ میرے دادا جان حافظ خدا بخش صغیرؒ کا ذکر۔ جن کے والد محترم حافظ محمد بخشؒ بچوں کو قرآن پڑھانے کے حوالے سے شہر بھر میں ایک معروف شخصیت تھی۔ جو اپنی نیکی، شرافت اور تقویٰ کی وجہ سے ایک مثال

بن کر لوگوں کے لیے شرافت کا نمونہ اور ذریعہ بنے رہے۔ میرے دادا جان ان کے بڑے بیٹے تھے۔ دادا جان کے چھوٹے بھائی حافظ غلام رسولؒ اور ان کے بیٹے حافظ افتخار الرسول مرحوم تھے اور ایک بیٹا مظفر اقبال آجکل کراچی میں مقیم ہے۔ حافظ غلام رسول، میرے ماموں جان، مولوی محمد دین راجع اور میرے ماموں زاد بھائی مولوی محمد یوسف یہ سبھی اسلامیہ ہائی سکول چنیوٹ میں مدرس رہے ہیں۔

دادا جان کے چار بیٹے تھے۔ والدِ محترم نذیر احمد المعروف نذیر مجیدی دوسرے بیٹے تھے۔ جبکہ بڑے بیٹے میاں دوست محمد اور دوسرے دو عبدالعزیز اور منیر احمد۔ منیر احمد بھی حافظ قرآن تھے۔ غرضیکہ میرے خاندان کا ہر فرد درس و تدریس سے وابستہ رہا اور شاید یہی وجہ ہے کہ شہر بھر میں ہمارے گھر کو ایک استاد گھرانے کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

میری دادی اماں حافظ بدرالدین کی بیٹی تھیں۔ دادی اماں کے چار بھائی تھے۔ حافظ مولا بخش، حافظ محمد حیات، میاں عبدالرزاق، اور مولوی عبدالرحیم۔ دادی اماں کو میں نے تو نہیں دیکھا کہ میں ابھی سال دو سال کا ہی تھا کہ وہ فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد واپس آئیں تو چند روز بیمار رہ کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ دادی جان بھی اردگرد کے تین چار محلوں کی لڑکیوں کو قرآن پڑھاتی تھیں۔ ہمارا گھر گویا مرکزِ درس قرآن کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ نیچے سے کوئی آواز دیتا تو آواز اوپر سنائی نہیں دیتی تھی کہ گھر سے قرآن پڑھنے اور پڑھانے کی صداؤں میں ہر آواز گم ہو کر رہ جاتی تھی۔

حافظ خدا بخش صغیرؒ:

دادا جان حافظ خدا بخش' صغیر تخلص کرتے تھے۔ پنجابی اور اردو کے شاعر تھے۔ ان کا کلام ''گلزارِ مدینہ'' نامی کتاب میں محفوظ ہے لیکن سانحہ یہ ہے کہ وہ کتاب ہمارے ہاں محفوظ نہ رہ سکی۔ اس کتاب میں ان کی منظوم خط و کتابت بھی ہے جو ان کے اس وقت کے دوست مشہور پنجابی شاعر مولوی دلپذیر بھیروی کے ساتھ رہی۔ دادا جان نے انہی کے ساتھ فریضہ حج بھی ادا کیا۔ مولوی دلپذیر دادا جان کی وفات (1940ء) کے بعد قادیانی ہو گیا تھا۔ اسی کتاب میں حج کرنے والوں کے لیے ایسی ہدایات بھی نظم کی صورت میں ان کے قلم سے لکھی گئیں جو حج کرنے والوں کے لیے رہنمائی کا کام دیتی تھیں۔

دادا جان کے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا ظفر علی خانؒ کے ساتھ ذاتی مراسم تھے۔ مولانا ظفر علی خان جب بھی چنیوٹ آئے، ہمارے گھر کے مہمان ٹھہرے۔ میرے چھوٹے بھائی صغیر احمد جو مجھ سے ایک سال چھوٹے ہیں ان کی پیدائش کے وقت ظفر علی خان میرے دادا جان کے مہمان تھے۔ صغیر احمد نام انہوں نے ہی تجویز کیا تھا۔ دادا جان چنیوٹ شہر کی پہلی تعلیمی درسگاہ ''اسلامیہ ہائی سکول'' کے بانیوں میں سے تھے، جس کی وجہ سے شہر کے رئیس ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ اسی مخالفت کے دوران انہیں شہر کے رؤسا کی اس قدر شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا کہ رؤسا کے کارندوں کی طرف سے انہیں سرِ بازار گالیاں دی گئیں اور بے عزت کیا گیا۔ اس پر بازار کے لوگ لٹھ لے کر ان کارندوں پر ٹوٹ پڑے اور انہیں زخمی حالت میں گھر واپس لوٹنا پڑا۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دادا جان محض اپنی شرافت، خلوص اور قومی کاموں میں انہماک کی وجہ سے شہر کے مسلمانوں میں کس قدر مقبول تھے۔ گھر کے اردگرد تین چار محلوں کے لوگ اپنے

زیورات داداجان کے ہاں بطور امانت رکھ دیا کرتے تھے اور پھر زیورات کی تیاری کے لیے بھی عورتیں انہیں سے استدعا کرتیں، کیونکہ شہر کے زرگر جو اکثر ہندو تھے، ان سے داداجان کا رابطہ تھا۔ میں اپنے بچپن میں شوٴ دیال نامی ہندو زرگر کی دکان پر بیٹھا انہیں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ یہ شوٴ دیال تقسیم ہند کے وقت والد صاحب کے کہنے پر مسلمان بھی ہوگیا تھا، لیکن جب ہندوستان سے ایک فوجی تنظیم ہندوؤں کو لینے کے لیے یہاں آئی تو یہ شخص دوبارہ ہندو ہوکر ان کے ساتھ واپس دہلی چلا گیا تھا۔

امیر شریعتؒ کی چنیوٹ میں پہلی تقریر:

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی پہلی تقریر میرے داداجان کی درخواست پر ہوئی۔ انجمن اسلامیہ چنیوٹ جس کی کاوشوں سے اسلامیہ ہائی سکول کا قیام عمل میں لایا گیا تھا اس کے کرتا دھرتا داداجان ہی تھے۔ چنیوٹ کی شیخ برادری اُن کی خصوصی معاون تھی۔ سکول کی کے لیے کچھ رقم کی ضرورت پڑ گئی تو شیخ برادری نے اُن سے کہا کہ آپ کلکتہ چلے جائیں وہاں ہماری برادری کے لوگ ہیں ان سے چندہ لے کر اس مالی ضرورت کو پورا کرلیں۔ داداجان نے کہا کہ اگر میں یہ رقم یہیں سے مہیا کرلوں تو پھر مجھے کلکتہ جیسے دور دراز شہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ داداجان گئے اور شاہ جی کو اپنے ساتھ چنیوٹ لے آئے۔ تقریر کے بعد شاہ جی نے سکول کی مالی معاونت کے لیے حاضرین جلسہ جن میں عورتیں بھی شامل تھیں سے اپیل کی جو اتنی موٴثر تھی کہ لوگوں نے دل کھول کر چندہ دیا بعض عورتوں نے اپنے زیورات اتار کر شاہ جی کے حوالے کردیئے۔ شاہ جی نے وہ سب کچھ داداجان کے حوالے کردیا اور اس کے بعد لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''بھائی مجھے بھی کچھ دو، جس پر دوبارہ چندہ ہوا۔ شاہ جی نے وہ رقم بھی داداجان کے حوالے کردی اور کہا کہ ''لو حافظ جی یہ میری طرف سے سکول کے لیے چندہ قبول کرلو''۔ بہرحال وہ مالی ضرورت پوری ہوگئی۔ یہ واقعہ غالباً ''الاحرار'' کے کسی پرانے شمارے میں بھی محفوظ ہے۔

''المنیر'' کا اجراء:

داداجان نے 1905ء میں چنیوٹ سے ایک ہفتہ روزہ اخبار کا اجراء کیا جس کا ذکر ''شہرِ لب دریا'' کے مصنف ڈاکٹر محمد امجد ثاقب اس طرح کرتے ہیں۔

> ''برصغیر میں بیسویں صدی کا آغاز غلامی کی انہی کہانیوں سے ہوتا ہے جنہیں موٴرخ نے ڈیڑھ سو سال سے لکھنا شروع کیا تھا۔ حریت فکر پر پہرے قائم تھے اور آزادیٴ اظہار کے گرد فصیلیں کھڑی تھیں۔ استبداد کے ان اندھیروں میں کچھ عہد ساز لوگوں نے فکر وعمل کے چراغ روشن کئے اور اپنے قلم کو قندیل بنا کر سیاست کے ساتھ ساتھ صحافت کے ذریعے قوم کی رہنمائی کا بیڑہ اٹھایا۔ ان شخصیات میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، مولانا حسرت موہانی اور مولانا محمد علی جوہر نمایاں ہیں۔ یہ وہ ہراول دستہ تھا۔ جس نے صحافت کے میدان پُرخار سے کانٹے چننا شروع کئے تاکہ اس ڈگر پر چلنے والوں پر راستے کی صعوبتیں کم ہوسکیں۔
>
> مولانا ابوالکلام نے کم سنی میں کلکتہ سے ہفت روزہ اخبار ''الصباح'' کی ادارت سنبھالی، مولانا ظفر علی خان کے والد سراج الدین نے 1903ء میں ہفت روزہ ''زمیندار'' کا اجراء کیا جسے ان کے انتقال (1909ء)

کے بعد ان کے فرزند مولانا ظفر علی خان نے شہرت کے نصف النہار تک پہنچایا۔ مولانا حسرت موہانی نے 1903ء میں ''اردوئے معلّیٰ'' کا آغاز کیا اور اردو شاعری کی روایات کے پیش نظر پہلے پہل رمز و کنایہ کے پیرائے میں اور رفتہ رفتہ مکمل جرأت اور بے باکی سے افکارِ تازہ کا علم لہرانا شروع کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر 1910ء میں ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' کے جلو میں ابھرے اور ان کے دم سے گلشنِ صحافت میں پھول ہی پھول بکھر گئے۔ آزادی فکر اور جرأتِ اظہار کی یہ لہر محض چند شہروں تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے اثرات پورے برصغیر میں پھیلنا شروع ہو گئے اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی حکایاتِ جنوں رقم ہونے لگیں۔

چنیوٹ ان دنوں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جس کے در و دیوار پر غربت اور پس ماندگی کی مہر ثبت تھی۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل کے ذرائع مفقود تھے۔ نہ ریل اس طرف کا رخ کرتی تھی نہ ہی دریائے چناب پر پل کی کمان کھنچی تھی۔ معاشی کسمپرسی اور جاگیردرانہ نظام کی شکار یہ بستی بیسویں صدی میں قدم رکھتے ہوئے اپنی کم مائیگی کے احساس سے ہچکچا رہی تھی۔ لیکن ان نامساعد حالات میں اس شہرِ علم و فن میں کچھ لوگ ایسے سامنے آئے، جنہوں نے ابوالکلام آزاد کی علمی روایات' ظفر علی خان کی جرأت و بے باکی، حسرت موہانی کی درویشی اور محمد علی جوہر کی فصاحت و بلاغت کی سنہری روایات کو مستحکم کیا۔

چنیوٹ کے کوچہ صحافت کے پہلے سنگ میل کی حیثیت ایک علم دوست شخصیت حافظ خدا بخش صغیر کو حاصل ہے۔ جنہوں نے 1905ء میں یہاں سے ایک ہفت روزہ ''المنیر'' کا اجراء کیا۔ جہالت کے اندھیروں میں یہ وہ پہلا چراغ تھا جس کی بدولت اس شہر کے افق پہ علم و ادب کے اجالے پھیلنے لگے۔ اس زمانے میں جھنگ سے ایک ہندو جریدہ ''جھنگ سیال'' کے نام سے نکلتا تھا۔ تعصب، تنگ نظری کی بنیاد پر اس میں مسلمانوں کو خوب مشقِ ستم بنایا جاتا۔ جھنگ کے مسلمان زعماء اور اہل قلم نے اس کی یاوہ گوئی کا خاطر خواہ جواب دینے کے لیے حافظ خدا بخش کو دعوت دی' کہ وہ جھنگ شہر سے جو ضلعی صدر مقام بھی تھا ایک رسالہ نکالیں جو ضلع بھر کے مسلمانوں کی ذہنی و فکری تربیت کے ساتھ ساتھ ان کے مسائل کو بھی منظر عام پر لا سکیں اور مذکورہ ہندو پرچے کی متعصّبانہ حکمت عملی کا پردہ چاک ہو۔ حافظ صاحب نے وقت کی اس ضرورت کو پہچانا، اپنی ساری جمع پونجی سمیٹی جو ان کے قلم اور دستی پریس پر مشتمل تھی اور رسالہ ''المنیر'' لے کر جھنگ منتقل ہو گئے اور اس طرح ضلع بھر کے مسلمان ''المنیر'' سے فیض یاب ہونے لگے۔ جھنگ میں ایک زبردست قلمی جنگ اور معاصرانہ چشمک کا آغاز ہوا۔ حافظ صاحب کا قلم شمشیر بُرّاں سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اپنے بھرپور انداز اور برجستہ طرزِ تحریر سے ادارہ ''جھنگ سیال'' کی دھجیاں بکھیر دیں اور یوں حافظ صاحب اور ان کے حلقہ ادارت کے زورِ قلم کی تاب نہ لاتے ہوئے ان کے مخالفین کو ''جھنگ سیال'' بند کرنا پڑا۔ حافظ خدا بخش صغیر میدان مار چکے تو جھنگ کو خیر باد کہہ کر پھر سے چنیوٹ پلٹ آئے۔ لیکن یہاں آکر ''المنیر'' کے دوبارہ اجراء کی بجائے انجمن اسلامیہ چنیوٹ سے منسلک ہو گئے اور اپنا تن، من دھن انجمن کے تحت تعلیمی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے وقف کر دیا۔ حافظ صاحب اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک انجمن اسلامیہ سے وابستہ رہے۔ 1940ء میں ان کی وفات کے ساتھ ہی چنیوٹ میں صحافت کا اوّلین باب ختم ہو گیا''۔

یہاں پر یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ ''المنیر'' کا ڈیکلریشن میرے چچا منیر احمد کے نام تھا۔ قیام پاکستان کے بعد مولانا عبدالرحیم اشرف مرحوم و مغفور کو ایک معاہدہ کے تحت چچا جان نے ''المنیر'' کی اشاعت کے لیے اجازت دے دی تھی۔ مولانا قیام پاکستان کے بعد چنیوٹ میں ہی آ کر آباد ہوئے تھے اور بعد میں فیصل آباد چلے گئے، معاہدہ یہیں چنیوٹ میں ہی ہوا تھا۔ اس طرح ''المنیر'' قیام پاکستان کے بعد لائل پور (فیصل آباد) سے بڑے تسلسل کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد یہ معاہدہ ختم ہوگیا اور مولانا عبدالرحیم اشرف نے ''المنبر'' کے نام سے اپنا رسالہ جاری کیا جو آج بھی مولانا کے فاضل فرزند ڈاکٹر زاہد اشرف کی ادارت میں فیصل آباد سے شائع ہو رہا ہے۔ گویا ''المنبر''، ''المنیر'' کا ہی تسلسل ہے۔

ایک عبرت ناک خواب:

دادا جان کی زندگی میں ایسے دن بھی آئے کہ انہیں قادیان جانے کا اشتیاق رات دن ستائے رکھتا تھا۔ شاید وہ یہ چاہتے ہوں کہ قادیانیوں سے براہِ راست رابطہ قائم کر کے ان کے عقائد کے بارے میں گفتگو کی جائے یا پھر وہ قادیانیت سے متاثر ہو گئے ہوں۔ بہر حال وجہ کوئی بھی ہو واقعہ یہی ہے کہ وہ قادیان جانا چاہتے تھے اور جب انہوں نے قادیان جانے کا پختہ ارادہ کر لیا تو ایک رات خواب میں ہی قادیان پہنچ گئے۔ دادا جان نے یہ خواب خود والدِ محترم کو سنایا اور والدِ محترم نے مجھے کہ جب تیرے دادا جان خواب میں قادیان پہنچ گئے تو لوگوں سے انہوں نے پوچھنا شروع کیا کہ مرزا غلام احمد کی قبر کہاں ہے؟ دل میں تھا کہ مرزا کی قبر پر فاتحہ پڑھ لیا جائے۔ لوگوں کے بتانے کے مطابق جب دادا جان ایک عمارت میں داخل ہوئے تو عمارت کے صحن میں ایک قبر ان کے سامنے تھی، دادا جان کو یقین ہوگیا کہ یہی مرزا کی قبر ہے۔ جوں ہی دادا جان نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے قبر درمیان سے پھٹی اور ایک لمبی دُم والا لنگور قبر سے برآمد ہوا اور عمارت کے اندر برآمدوں میں اِدھر اُدھر بھاگتا نظروں سے غائب ہوگیا۔ دفعتاً دادا جان کی آنکھ کھل گئی اور زبان پر **لاحول ولاقوۃ الا باللہ** کا ورد جاری ہوگیا۔ جس کے بعد قادیانیوں کے بارے میں اُن کے ذہن میں کوئی نرم گوشہ تھا بھی تو ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔

دادا جان کی رحلت:

1940,39,38 میں ہم لائل پور میں مقیم تھے دھوبی گھاٹ کے ایک مکان میں رہائش تھی۔ گجر بستی نزد عید گاہ کے ایک مڈل سکول میں والدِ محترم انگریزی کے استاد کے طور پر ملازم تھے۔ اسی سکول میں انہوں نے مجھے بھی داخل کرا دیا۔ میرا چھوٹا بھائی نصیر اور ایک بہن اسی مکان میں پیدا ہوئے۔ اقبال بچپن میں ہی فوت ہوگئی تھی جسے لے کر ہم چنیوٹ آ گئے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے دادا جان میری بہن کی میت کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھائے لوگوں کے آگے آگے چل رہے تھے اور میں اپنے ابا جی کا ہاتھ تھامے روتا روتا قبرستان پہنچا تھا۔ جنازہ بھی میرے دادا جان نے ہی پڑھایا تھا۔ میرے سامنے میری بہن کی تدفین ہوئی تھی۔ چھوٹے بھائی نصیر کی پیدائش پر میں اپنے دادا جان کے ساتھ چنیوٹ میں تھا۔ بھائی کی پیدائش کی خبر سن کر دادا جان مجھے اپنے ساتھ لائل پور لے کے آئے تھے۔ یہ سفر مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب ان کا

انتقال ہوا تو میری عمر تقریباً چھے سال ہوگی اس وقت میں دوسری جماعت کا طالب علم تھا۔ روزانہ والد صاحب سائیکل پر بٹھا کر مجھے اپنے ساتھ سکول لے جاتے تھے۔ یہ سائیکل والد صاحب نے علامہ طالوت مرحوم سے خریدا تھا۔ ایک مرتبہ علامہ طالوت مرحوم ہمارے گھر مہمان ہوئے ان کے پاس صندوق کی طرح کا ایک بڑا لکڑی کا ڈبہ تھا۔ والد صاحب نے پوچھا یہ کیا لائے ہو؟ جواب میں علامہ طالوت مرحوم نے کہا کہ سائیکل خریدا ہے ”ریلے“ ہے (جرمنی کا سائیکل)۔ والد صاحب نے کہا کہ تمھیں جتنی اس کی ضرورت ہے اس سے زیادہ اس کی مجھے ضرورت ہے۔ یہ سائیکل مجھے دے دو۔ علامہ طالوت مرحوم نے جواباً کہا کہ تم لے لو۔ چنانچہ وہ سائیکل صرف ستر روپے میں والد صاحب نے ان سے خرید لیا تھا۔ علامہ طالوت مرحوم سے والد صاحب کی دوستی میری پیدائش سے بھی پہلے کی تھی۔ لیکن دوستی پروان اس وقت چڑھی جب دونوں اسلامیہ ہائی سکول چنیوٹ میں اکٹھے ہوگئے۔ علامہ طالوت مرحوم مدت تک اسی سکول میں عربی ٹیچر کے طور پر پڑھاتے رہے، جہاں والد محترم انگریزی پڑھاتے تھے۔

انتقال کی خبر :

ان دنوں والد صاحب سکول سے واپس آکر چنیوٹ کے ایک شیخ زادے کو ڈگلس پورہ میں ان کے گھر ٹیوشن پڑھانے جاتے تھے۔ میں گھر پر تھا کہ دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو چنیوٹ سے ایک ہمارے جاننے والا شخص میرے سامنے تھا، کہنے لگا تیرے والد صاحب کہاں ہیں؟ میں نے کہا گھر پر نہیں وہ تو ڈگلس پورہ گئے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا کہ تمھیں اس گھر کا پتہ ہے؟ میں کہا کہ ہاں، اس نے ساتھ چلنے کو کہا کہ انہیں ایک ضروری پیغام دینا ہے اور اسی لیے میں خصوصی طور پر چنیوٹ سے آیا ہوں۔ میں نے والدہ صاحبہ سے ذکر کیا، تو انہوں نے کہا کہ اس کا نام پوچھو، میں نے نام پوچھا تو اس نے کہا رفیق چنیوٹی۔ والدہ صاحبہ نے اجازت دے دی۔ میں اسے ساتھ لے کر ڈگلس پورہ پہنچ گیا۔ اس نے واپسی پر راستے میں داداجان کے انتقال کی خبر سنائی۔ مجھے یاد ہے والد صاحب نے رونا شروع کر دیا، خبر سن کر میں نے بھی ساتھ رونا شروع کر دیا۔ گھر آئے تو جلدی سے تیاری کر کے ہم چنیوٹ پہنچے۔ چنیوٹ اڈے پر میرے ماموں میاں غلام مرتضٰی راجھہ مرحوم ہمارے انتظار میں ایک ٹانگہ لیے کھڑے تھے۔ والدہ مرحومہ کو گھر بھیج دیا گیا اور میں اپنے ابو کے ساتھ جنازہ گاہ پہنچا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا شہر ہی جنازہ گاہ پہنچ گیا ہے۔ بعض لوگوں نے جنازے میں شرکت نہیں کی لیکن جنازہ گاہ سے ملحقہ پارک میں موجود رہے۔ میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں بتایا گیا کہ یہ شہر کے ہندو ہیں جو احتراماً جنازہ گاہ آئے ہیں۔ پورے شہر میں اس دن دکانیں بند کر دی گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے سوگوار فضا نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔

دادا جان کی رحلت اچانک ہوئی تھی نہ کوئی بیماری نہ عارضہ‘ ظہر کی نماز مسجد میں جا کر پڑھنے کے لیے حسب معمول گھر سے نکلے، بازار سے گزرتے ہوئے لوگوں کو دکانیں بند کر کے نماز کے لیے کہتے تھے یہ ان کا معمول تھا۔ اس روز بھی لوگوں سے یہی کہتے ہوئے دکانیں بند کراتے جاتے تھے۔ لیکن جب مسجد کی سیڑھیوں پر قدم رکھا تو گرے لوگوں نے فوراً ڈاکٹر فیض کو بلایا‘ جس کا ہسپتال اس ”مسجد چنیوٹیاں“ کے قریب ہی تھا۔ ڈاکٹر نے چیک کیا اور کہا کہ موت پہلے ہوئی

ہے گرے بعد میں ہیں۔ یہ ''ہارٹ فیل'' کیس ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ اسی روز صبح کے وقت اسی محلّہ چنیوٹیاں میں ایک عورت کا انتقال ہوا، دادا جان وہاں ان کی دلجوئی کے لیے پہنچے، کفن اپنے ہاتھ سے تیار کیا اور اعلان کیا کہ ظہر کی نماز کے بعد جنازہ اٹھایا جائے گا لیکن وہ جنازہ بعد میں پڑھایا گیا پہلے دادا جان کا جنازہ ادا ہوا۔ اس محلے کے لوگ دادا جان کو پیروں کی طرح مانتے تھے۔ انتہائی قدر و منزلت سے دیکھتے، عقیدت مندوں کی اکثریت اس محلے میں رہائش پذیر تھی۔ دونوں طرف کی بات سن کر کہتے کہ میرے خیال میں اس طرح کرلیا جائے تو معاملہ سلجھ سکتا ہے۔ پھر اس کے بعد کسی میں اتنی ہمت یا جرأت نہ ہوتی کہ ان کے فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کردے، دادا جان کی شرافت، ان کے خلوص نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرلیا تھا اُن کی باتوں کو ماننا وہ اپنی روحانی تسکین کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

آئے عشّاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

(جاری ہے)

سکول، کالج اور دینی مدارس کے طلباء و طالبات نیز تمام خواتین و حضرات کے لیے

فہمِ ختمِ نبوت خط کتابت کورس

- خط کتابت کے ذریعے گھر بیٹھے عقیدۂ ختم نبوت سے مکمل آگاہی اور منکرینِ ختم نبوت کے عقائد و نظریات سے واقفیت حاصل کریں۔
- داخلہ کے لیے سادہ کاغذ پر اپنا نام، ولدیت، تعلیم و پیشہ، فون نمبر اور ڈاک کا مکمل پتا لکھ کر ارسال کریں ● ایک لفافہ میں صرف ایک ہی درخواست بھیجیں۔
- ایس ایم ایس کے ذریعے اپنا نام و پتہ بھیج کر داخلہ لے سکتے ہیں۔
- کورس مکمل کرنے پر ایک خوبصورت سند، جبکہ نمایاں کارکردگی پر شرکاء کو خصوصی تحائفِ کتب دیئے جائیں گے۔

داخلہ جاری ہے

رابطہ دفتر مجلس احرار اسلام مسجد سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، تلہ گنگ (غرب) ضلع چکوال (پنجاب)
0300-5780390,0300-4716780